خصوصی تجزیہ

نفاذِ شریعت ایکٹ پر اعتراضات کا
---- ایک علمی محاکمہ ----

قسط (۲)

پروفیسر خورشید احمد

معترضین کے باقی نکات پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک اصولی نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات کی غلط فہمی غلط مبحث کا نتیجہ نہیں اور اخلاص پر مبنی ہے ' اس کی وجہ غالباً مندرجہ ذیل وجوہ میں سے ایک یا دونوں ہو سکتی ہیں:

۱۔ قانون کے مغربی تصور اور اسلامی تصور میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ مغربی تصورِ قانون میں مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف ان انسانی روابط و سلوک کے قواعد و ضوابط سے ہے جو بالآخر عدالتوں کے ذریعہ نافذ ہو سکیں اور جن کی عدم پابندی جرم و سزا پر منتج ہوتی ہے۔ مشہور ماہرِ قانون پیٹن (paton) اپنی کتاب Text book of Jurisprudence میں قانون کی یہ تعریف کرتا ہے:

> ''قانون وہ آئینی نظام ہے' جسے کوئی معاشرہ یا اجتماع اصطلاحاً'' یا رسماً'' اختیار کرے اور یہ اس مجموعۂ قوانین پر مشتمل ہوتا ہے جسے یہ اجتماع اپنے ہاں ایک خاص مشینری کے قیام کے ذریعہ بغرضِ حصولِ اطاعت نافذ کرنے کے لئے آمادہ ہو''۔ (صفحہ ۸۵)

یہی وجہ ہے کہ قانون اور ریاستی اعتبار سے قوت قاہرہ (Coercive power) لازم و ملزوم ہیں۔

اس کے برعکس اسلام کا تصورِ قانون زیادہ وسیع ہے' یہاں ہر قانون کے لئے عدالت کے ذریعہ نافذ ہونا ضروری نہیں ہے' گو اسلامی قانون کا ایک حصہ ایسا ہے جو ریاست کی قوتِ قاہرہ

کے ذریعہ نافذ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون عبادات ' معاملات ' مناکحات ' سیاستِ مدن ' جنگ و صلح سب پر حاوی ہے۔ شریعت کو بالاتر قانون ماننے کے معنی یہ ہیں کہ پوری شریعت بالاتر قانون ہوگی جس کا کچھ حصہ فرد خود اپنے اوپر نافذ کرے گا اور کچھ حصے حکومت کے اداروں کے ذریعہ نافذالعمل ہوں گے۔ اور اس طرح اخلاق اور قوتِ قاہرہ کے امتزاج سے فرد اور معاشرہ کی اصلاح کا کام انجام پاتا ہے۔

۲۔ دوسری وجہ کا تعلق قانون کی اس اینگلو سیکسن (Anglo - Saxon) روایت سے ہے جس سے ملک کا قانون دان طبقہ آشنا ہے اس روایت کے مطابق کم از کم نظری طور پر ' رائج "مجموعہ قوانین" سے ہٹ کر کسی بالاتر قانون کو ماننا' اور پھر اس بالاتر قانون کی روشنی میں خود "مجموعہ قوانین" پر نقد و احتساب کا کام انجام دینا' ایک غیر معروف سی شے ہے۔ پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون اعلیٰ ترین قانون سمجھا جاتا ہے' اور روایتی پوزیشن یہی ہے کہ پارلیمنٹ حاکم اعلیٰ ہے اور اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی!

اسلام تو ظاہر ہے کہ اس پوزیشن کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کی نگاہ میں فرد اور ریاست دونوں ' اور اس طرح خود ریاست کے اداروں میں پارلیمنٹ ' انتظامیہ اور عدلیہ سب 'ایک بالا تر قانون کے تابع ہیں ' اور وہ ہے قرآن و سنت۔ اصل حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے' اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نمائندہ اور رسول کی حیثیت سے شارع کا مقام رکھتا ہے۔ پارلیمنٹ کا کام شریعت کے مطابق قانون سازی کرنا ہے۔ اور جن معاملات میں کتاب و سنت خاموش ہوں ان کے بارے میں شریعت کے مقاصد کی روشنی میں نئی قانون سازی کرنا ہے۔

لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں عام طور پر ' ان سیکولر اور جمہوری ممالک میں بھی جو عوام کی حاکمیت اور پارلیمنٹ کی بالادستی کے اصول پر قائم ہیں ' جہاں نظام جمہوری ہے لیکن روایات پر بھی قائم ہے' پارلیمنٹ یا مقننہ کی یہ حاکمیت مطلقہ تسلیم کی گئی ہے ؟ کیا کہیں بھی پارلیمنٹ کا حق قانون سازی لا محدود ہے؟ کیا اس پر عموماً پارلیمنٹ سے ما سوا اداروں کو نقد و احتساب اور رد و قبول کا حق نہیں دیا گیا ہے ؟ کیا خود پاکستان میں ایسا نہیں ؟ اور کیا ایسا ہونے سے جمہوریت ' رائے عامہ کی اور پارلیمنٹ کی بالادستی ختم ہو جاتی ہے؟

ان سوالات کے جائزہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجائیگی کہ قرآن و سنت کی بالادستی اور اس ضمن میں نقد و احتساب کے اختیارات عدالتوں کو تفویض کرنے کے نتیجے میں [illegible]

بالادستی ختم ہو جانے کا ڈھنڈورہ کتنا بے بنیاد ہے۔

برطانیہ کی قانونی تاریخ کا بھی اگر جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ جدید سیکولر (لادینی) فکر کے غلبہ سے قبل وہاں بھی پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کو حقوق عامہ اور عقل سلیم پر فوقیت نہیں دی جاتی تھی۔ لارڈ جسٹس کوک (Coke) نے ۱۶۱۰ء میں ڈاکٹر بونہام کے مشہور مقدمہ میں اپنے فیصلہ میں لکھا تھا کہ

> "جب پارلیمنٹ کا منظور کردہ کوئی قانون عام حق (Common Right) یا عقل سلیم (Reason) کے خلاف ہوگا یا اس پر عمل ناممکن ہوگا تو پھر معاملہ کا فیصلہ کامن لاء کی روشنی میں ہوگا اور ایسے وضعی قانون کو غیر مؤثر (Void) قرار دیا جائے گا"۔ ((77 E.R. 647' 652 (1610)

جسٹس کوک کے جانشین لاڈر چیف جسٹس ہوبرٹ (Hobert) نے بھی اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے۔

> "پارلیمنٹ کا بنایا ہوا ایک وضعی قانون بھی، اگر وہ فطری انصاف (Equity Natural) کے خلاف ہے تو اسے غیر مؤثر قرار دیا جائے گا۔"

(Day vs Savadge, 80 , E.R. 235 ' 237' (1615)

اسی طرح چیف جسٹس ہولڈ (Hold) نے بھی اس موقف کی تائید کی۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جس میں دستور مملکت کو ایک تحریری دستاویز میں منضبط کیا جانے لگا۔ امریکہ میں تحریری دستور بننے کے بعد دستور کو بالاتر قانون تسلیم کیا گیا اور کانگریس قانون سازی میں اس کے تابع ہے۔ جسٹس مارشل کا یہ فیصلہ آج تک امریکی قانونی روایت کی بنیاد ہے کہ

> "دستور خود سب سے بڑا قانون ہے اور یہ ذمہ داری عدالتوں کی ہے نہ کہ مقننہ کی، کہ کونسا قانون دستور کی حدود سے تجاوز کر گیا ہے اور کس بناء پر وہ غیر مؤثر ہے"۔

(Marbury v.s. Madison)

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سو سال میں امریکہ کی عدالتِ عالیہ نے دو سو سترہ قوانین کو خلاف دستور، بے ضابطہ اور غیر مؤثر قرار دیا ہے اور اس سے نہ مقننہ کی ناک کٹی ہے نہ اس کی بالادستی پر کوئی حرف آیا ہے اور نہ عدالت کی "آمریت" کا کوئی ہوا کھڑا ہوا ہے۔ بلکہ مقننہ کا قانون سازی کا حق اور عدلیہ کا قانون کو "بالاتر قانون" کی میزان پر پرکھنے کا اختیار —— دونوں

جمہوری روایت کا حصہ تسلیم کیے جاتے ہیں، ان جمہوری روایات کا جو حاکمیتِ الٰہی نہیں بلکہ حاکمیتِ جمہور پر قائم ہیں۔

دنیا کے دساتیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر ممالک میں بالا ترین پارلیمنٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دستور کے مطابق قانون سازی کا کام انجام دے۔ فرانس، کینیڈا، ڈنمارک، فن لینڈ، ایران اور کیمیرون میں تو ایسی دستوری کونسل کا وجود ہے جو پارلیمنٹ میں کسی بل کے پیش ہونے کے بعد، اور پارلیمنٹ میں اس کے منظور ہونے یا صدر کی توثیق سے پہلے ہی اس بل کے دستوری یا دستور سے متصادم ہونے کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ مگر دنیا کے بیشتر ممالک میں عدالتوں ہی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک بل کے منظور ہونے کے بعد بھی اس کا جائزہ لیں اور اگر اسے دستور سے متصادم پائیں تو کالعدم قرار دے دیں۔ ارجنٹائن میں یہ مقام عام عدالتوں کو دیا گیا ہے۔ آسٹریلیا، ڈنمارک، اسرائیل، اردن، ناروے، پاکستان، ہندوستان اور امریکہ میں یہ اختیار عدالت عالیہ (High Court) کو حاصل ہے جس کے فیصلہ پر آخری فیصلہ سپریم کورٹ کرتی ہے۔ کچھ دوسرے ممالک میں قانون منظور ہوجانے کے بعد اعلیٰ عدالتوں میں صرف سپریم کورٹ ہی قوانین کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ یہ پوزیشن آسٹریا، برازیل، کیمیرون، کوسٹاریکا، آئرلینڈ، جاپان، ویت نام، سینیگال میں پائی جاتی ہے۔ کچھ دوسرے ممالک میں ایک علیحدہ دستوری عدالت یا کونسل قائم کی گئی ہے جس کا کام صرف دستوری امور کا فیصلہ کرنا ہے۔ ایسی دستوری عدالتیں آسٹریا (Austria) جرمنی، اٹلی، مالٹا، کوریا، اسپین، سری لنکا اور یوگو سلاویہ میں قائم ہیں۔ ہندوستان میں تو سپریم کورٹ عام قوانین ہی نہیں، دو تہائی اکثریت سے منظور شدہ دستوری ترمیم کو بھی غیر دستوری قرار دینے کی روایت قائم کر چکی ہے اور اس سے بھی پارلیمنٹ کی بالا دستی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کو عدالت کے احتساب کے لیے کھولنا جمہوری روایت کا حصہ ہے۔ اس سے نہ پارلیمنٹ کی حاکمیت پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ پارلیمنٹ پر عدلیہ کی بالا دستی قائم ہوتی ہے۔ ہمارے قانون ساز اداروں کے ان ارکان کو جو پارلیمنٹ کی بالا دستی کی دہائی دے کے شریعت کی بالا دستی کی مخالفت کرتے ہیں، وہ خود بیشمار معاملات میں پارلیمنٹ کے قوانین کو مسترد کرنے کا حق عدالتوں کو تفویض کرتے ہیں۔ پھر صرف شریعت کے معاملہ میں ہی ایسی حساسیت یا نزاکت کا مظاہرہ کیوں؟ جدید سیاسی نظریہ تو مبنی ہی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان توازنِ اختیار

(Balance of power) پر ہے۔ اس سے کسی ایک ادارہ پر دوسرے کے بالا دستی قائم نہیں ہوتی بلکہ ہر ایک دوسرے سے اس طرح مربوط اور متعلق ہوتا ہے کہ عوام کے حقوق محفوظ ہو سکیں اور ریاست کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔

پارلیمنٹ کے جن ارکان یا دوسرے مبصرین نے شریعت کے بالاتر قانون تسلیم کئے جانے سے پارلیمنٹ کی حاکیت پر حرف آنے کی دہائی دے کر جس "نازک مزاجی" کا مظاہرہ کیا ہے وہ ناقابل فہم ہے۔ شریعت کی بالادستی پر 'جس کے اقرار ہی سے ہم مسلمان بنتے ہیں' تو وہ اتنے برا فروختہ ہیں' لیکن اس امر پر ان کی پیشانی پر شکن بھی نہیں پڑتی کہ بہت سے معاملات میں پارلیمنٹ کے ہاتھ اور پاؤں آج بھی بندھے ہوئے ہیں۔ اور اس دستور کے تحت بندھے ہوئے ہیں جسے ۱۹۷۳ء کا "اصل دستور" کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر قانون سازی کے لئے دو فہرستیں دستور میں دی گئی ہیں' اور ان سے ہٹ کر پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں کے لیے قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں' اسی طرح صوبوں کی حدود کے بارے میں پارلیمنٹ صرف اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی۔ دفعہ ۲۲۷' احکامات اسلامی کے بارے میں پارلیمنٹ کے اختیارات کی تحدید کرتی ہے۔ دستور اور دستور کے شیڈولڈز کی بناء پر ۲۵ قوانین ایسے ہیں' اور ان میں سے بیشتر قوانین وہ ہیں جو فوجی آمریت کے ادوار میں بنائے گئے تھے' جن میں عام قانون سازی کے طریقے پر کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ ۱۹۷۳ء کے اس دستور میں جسے جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے منظور کرایا تھا' وزیر اعظم کے ایک بار منتخب ہوجانے کے بعد اس کو عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعہ ہٹانے کے معروف طریقہ کو اس طرح جکڑ بندیوں کا شکار کرایا گیا تھا کہ عملاً پارلیمنٹ اور خود حکمران پارٹی کو وزیر اعظم کو ہٹانے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس پر خود بھٹو صاحب کے سابق وزیر قانون جناب محمود علی قصوری نے بڑے سخت الفاظ میں اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ دستور کی دفعہ ۸ بھی پارلیمنٹ کے حق قانون سازی پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے اور صحیح طور پر کرتی ہے۔ لیکن اتنے بہت سے "بالاتر قوانین" کی موجودگی میں پارلیمنٹ کی "حاکمیتِ اعلیٰ" متاثر نہیں ہوئی' البتہ اللہ کی شریعت کو بالاتر قانون تسلیم کرنے سے اسکی ناک کٹ جاتی ہے؟

ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے!

تیسرے اور چوتھے اعتراض کے بارے میں مندرجہ بالا معروضات کافی ہیں۔ البتہ آخری اعتراض میں وزن ہے، مگر اس کا مناسب حل ممکن ہے اور ضرور کیا جانا چاہیے۔ چونکہ ہمارا تعلیمی نظام، اور خصوصیت سے قانون کی تعلیم کا نظام، ناقص ہے، اسی طرح عدلیہ کے لئے تقرری کا معیار (Criterion) بھی اسلامی اعتبار سے ناکافی ہے، اس لئے ان سب کی اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ فی الحقیقت عدلیہ میں ہر سطح پر جدید قانون اور اسلامی فقہ اور اصول فقہ کا علم رکھنے والے افراد آسکیں۔ اس کمی کا تقاضہ ہے کہ اسے جلد از جلد پورا کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ عدلیہ کے موجودہ افراد کے لئے خصوصی تربیتی پروگرام، اعلیٰ جوڈیشل اکیڈیمی کے تحت فوری طور پر شروع کئے جائیں، عدلیہ میں مختلف سطح پر دینی علم رکھنے والے علماء اور فقہاء کا تقرر بطور جج، مفتی یا مشیر عدالت کیا جائے اور مستقبل کے لئے قانون کی تعلیم کے نظام کی اصلاح اور عدالت میں تقرری کے معیار کو وسیع کیا جائے تاکہ مستقبل کی عدلیہ جدید قانون اور اسلامی فقہ اور اصول فقہ دونوں پر مہارت رکھنے والوں پر مشتمل ہو سکے۔

البتہ اعتراض کا یہ پہلو قطعاً ناقابل قبول ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ چونکہ ایسے افراد نہیں ہیں اس لیے شریعت کے نفاذ کے عمل میں عدلیہ کو کوئی کردار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر یہ دلیل صحیح ہے تو پھر ہم بڑے ادب سے عرض کریں گے کہ جو حالت آج قانون ساز اداروں کے ارکان کے علوم دینی و دنیاوی پر مہارت کی ہے اس کی روشنی میں تو ان کو قانون سازی کے اختیارات دینا بھی محل نظر ہو جائے گا۔ مسئلہ کا حل اس کمی کو پورا کرنا ہے، جو عدلیہ کے موجودہ نظام میں ہے۔ اور اسی طرح خود مقننہ اور اس کے افراد کے معیار کو بلند کرنے کی بھی فکر ہونی چاہیے۔ جیسا کہ دستور کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کا تقاضا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی غیر متعلق نہیں ہوگا کہ جب برطانوی دور میں شخصی قانون کو سامراجی قوتوں کے مسلط کردہ قانون کے دائرہ سے باہر رکھا گیا، اور اسے مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے اپنے مذہبی قانون کے تابع کیا گیا، تب بھی اس خدشہ کا اظہار ہوا تھا کہ ایک مذہبی قانون کو نافذ کرنے کی ذمہ داری اس عدلیہ کو دی جارہی ہے جو اس قانون کی ماہر نہیں۔ بلکہ وہاں تو مسلم پرسنل لاء کا نفاذ غیر مسلم ججوں تک کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن چونکہ قانون کی مسلمہ کتابوں اور ماخذ کا بالعموم احترام کیا گیا اس لئے انگریز کے سو سالہ دور میں چند ہی واقعات ایسے ہوئے جب عدلیہ کا فیصلہ فقہ اور اصول فقہ کے خلاف تھا، اور ان حالات میں مسلمان اہلِ علم اور وکلاء نے تنقید و احتساب کے ذریعہ صحیح اسلامی پوزیشن کو پامال ہونے سے

بچالیا۔

گزشتہ دس بارہ سال کا تجربہ بھی اس کا گواہ ہے کہ عدلیہ کے فیصلوں میں اب شریعت اور اس کے احکام و قوانین پر زیادہ کھل کر بحث ہو رہی ہے اور مسلمان فقہاء کی آراء سے استشہاد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایک مثبت عمل ہے اور اس کے اچھے نتائج نکلیں گے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہماری رائے میں کسی قانون کے شریعت کے خلاف ہونے کے بارے میں فیصلہ کا اختیار موجودہ حالات میں 'فیڈرل شریعت کورٹ یا عدالت عالیہ (ہائی کورٹ ' سپریم کورٹ) تک محدود کرنا قرینِ حکمت ہے۔ یہی مؤقف سینٹ میں پاس شدہ بل میں اختیار کیا گیا تھا اور ہم اسے موجودہ ایکٹ سے رونما ہونے والی پوزیشن کے مقابلہ میں واضح سمجھتے ہیں ۔ ہماری نگاہ میں اس مسئلہ پر حکومت اور پارلیمنٹ کو غور ، فکر جاری رکھنا چاہیے۔ اور جتنا جلد ممکن ہو ترمیم کے ذریعہ اس پوزیشن کو واضح کر دینا چاہیے ۔ البتہ جب چند سالوں کے تجربہ سے 'اور عدالتی نظام میں ہر سطح پر دین کا علم رکھنے والے لوگوں کے شامل ہوجانے سے ' صورت حال بہتر ہوجائے تو پھر دائرہ کو وسیع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ آخر بارہ تیرہ سو سال تک مسلمانوں کے نظامِ قضاء میں نچلی اور اعلیٰ دونوں سطح کے قاضی ہی ان امور پر فیصلہ کرتے رہے ہیں اور کبھی ذہنی خلفشار کی صورت پیدا نہیں ہوئی ۔ اگر کہیں فیصلہ میں خطا ہوئی ہے تو جلد ہی اسکی اصلاح بھی اسی نظام کے اندر ہوگئی ہے' اور یہی راستہ فکری اور عملی ترقی کا راستہ ہے۔

ضروری اطلاع

بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر نومبر ۹۱ء کا شمارہ بروقت شائع نہ ہو سکا' چنانچہ نومبر ۹۱ء اور دسمبر ۹۱ء کا مشترکہ شمارہ شائع کیا گیا' اس شمارے کی ضخامت بھی دوگنی تھی۔

مذکورہ اشاعت کو شمارہ نومبر' دسمبر ۹۱ جلد ۱۱۶ عدد ۳ '۴ تصور کیا جائے۔

منیجر

ماہنامہ' ترجمان القرآن لاہور